ĪQĀN -Vol: 04, Issue: 01, Dec-2021
DOI.10.36755/iqan145.2021,PP: 54-67

OPEN ACCESS
Name
3336-2617pISSN:
3700-2617eISSN:
www.iqan.com.pk

مذاہب عالم کی اصلاحی تحریکوں کا تحقیقی جائزہ

A research review of the reform movements of world religions

* ***Dr.Sobia Khan*** *< sobiakousar88@gmail.com>*
Assistant Professor. GSCUW, Bahawalpur,

Version of Record
Received: 15-Sep-21; **Accepted** :01-Nov-21; **Online/Print**: 31-Dec-21

ABSTRACT
Religious reform movements and religious economic movements differ greatly in their goals, organization, and manifestos. Reform movements emphasize the need to bring about change in society and to make individuals righteous in character. These worship for this purpose. Mention Meditation Use sermons and preaching. They have no restrictions on membership of the organization and their doors are open to everyone so that more and more people can benefit from them. In this way these movements emerge from below and create a public character within them. Do Leadership is not important in such organizations. The aim of reform movements is to reform society first. When society improves, political and economic changes will result automatically. Therefore, these movements are usually isolated from politics and do not like to confuse themselves in political disputes. Her argument is that in that case she will be in conflict with her political rivals and will not be able to do her job. On the contrary, we would call other movement's reformist. Because they do not raise the slogan of revival or revolution, but they want to reform the present society without any fundamental change. They bring religion out of the past by adapting it to the modern age and try to eliminate the contradictions that exist between the basic religion and the modern requirements by adapting its teachings to the modern age.

Keywords: *Reform Movements. World Religions. Review*

cc BY

مذہب کا انسانی زندگی سے اس قدر گہرا تعلق ہے کہ جب بھی کسے سیاسی و سماجی اور معاشی ضروریات کے تحت کسی جواز کی تلاش ہوتی ہے تو وہ اس کی جڑیں مذہب میں تلاش کرتا ہے۔ اگرچہ اب سائنس و ٹکنالوجی اور سماجی علوم کی ترقی نے مذہبی اقدار کو کمزور کر دیا ہے مگر اس کے باوجود مذہبی علامات و اشارے اب بھی انسانی ذہن کو متاثر کرتے ہیں۔ مسلمان معاشرے میں مذہب کی جڑیں اس قدر گہری اور مضبوط ہیں کہ وہ زمانہ کی نئی تبدیلیوں کے باوجود ابھی تک سیاست، معیشت اور سماجی اقدار کو اس کی بنیاد پر تشکیل کرنا چاہتے ہیں۔

اصلاحی تحریکوں کی کے اہم ترین عوامل میں سے ایک عامل، شائستہ اور باصلاحیت رہبر وراہنما کا موجود ہونا ہے۔ تاریخ میں مذکور مختلف تحریکوں اور انقلابوں کا جائزہ لینے کے ساتھ ہم اس حقیقت تک پہنچتے ہیں کہ کوئی بھی تحریک شائستہ رہبر کے بغیر نتیجے تک نہیں پہنچی اور جاری نہیں رہی ہے۔ قرآنِ کریم بھی رہبریت کے لیے کہ جس کو امامت و پیشوائی سے تعبیر کرتا ہے، خاص اہمیت کا قائل ہے اور بہت سی آیات میں اسی مسئلے کو بیان کرتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی داستان میں، جب وہ اس منصبِ امامت کو اپنی نسل کے لیے بھی درخواست کرتے ہیں تو خداوند متعال اِس منصبِ امامت کو عدم ظلم کے ساتھ مقید فرماتا ہے:

"وَإِذِ ٱبْتَلَىٰٓ إِبْرَٰهِـۧمَ رَبُّهُۥ بِكَلِمَـٰتٍ فَأَتَمَّهُنَّ ۖ قَالَ إِنِّى جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا ۖ قَالَ وَمِن ذُرِّيَّتِى ۖ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِى ٱلظَّـٰلِمِينَ"[1]

"اور یاد کرو اس وقت کو جب ابراہیمؑ کے پروردگار نے انہیں چند کلمات کے ذریعے آزمایا اور انہوں نے انہیں پورا کر دیا، تو اُس نے کہا: ہم تمہیں لوگوں کا امام بناتے ہیں۔ ابراہیمؑ نے عرض کی: اور میری ذریت میں سے؟ تو ارشاد ہوا کہ یہ میرا عہدہ (امامت) ہرگز ظالمین کو نہیں دیا جائے گا"

مذہب کی تاریخ کے مطالعہ سے جو بات ہمارے سامنے واضح ہو کر آئی ہے وہ یہ ہے کہ جب بھی نئی تبدیلیاں آتی ہیں تو یہ مذہب کے لئے ایک چیلنج کا باعث ہوتی ہیں۔ اور اس لئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہ اپنی قدامت کو برقرار رکھے یا نئی تبدیلیوں کے ساتھ خود کو بھی تبدیل کرے؟ اس چیلنج کا جواب مذہب دونوں صورتوں میں دیتا ہے۔ وہ اپنی قدامت اور بنیاد کو قائم بھی رکھنا چاہتا ہے اور اس کے ساتھ وہ اپنی تعلیمات کی نئی تعبیر و تفسیر کے ذریعہ نئی تبدیلیوں کو اپنے اندر سمانا بھی چاہتا ہے۔ اصلاحی تحریکیں اس وقت کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہوتی ہیں جب معاشرے کے اکثر افراد اور تمام دھڑے اس کے حق میں کھڑے ہو جائیں۔ اس حقیقت کو قرآنِ کریم کی مختلف آیات سے اخذ کیا جا سکتا ہے:

"إِنَّ اللَّهَ لا يُغَيِّرُ ما بِقَومٍ حَتّىٰ يُغَيِّروا ما بِأَنفُسِهِم ۗ وَإِذا أَرادَ اللَّهُ بِقَومٍ سوءًا فَلا مَرَدَّ لَهُ ۚ وَما لَهُم مِن دونِهِ مِن والٍ"[2]

"اللہ کسی قوم کی حالت کو اس وقت تک تبدیل نہیں کرتا جب تک وہ خود اپنی حالت کو تبدیل نہ کرے"

"ذٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ لَم يَكُ مُغَيِّرًا نِعمَةً أَنعَمَها عَلىٰ قَومٍ حَتّىٰ يُغَيِّروا ما بِأَنفُسِهِم ۙ وَأَنَّ اللَّهَ سَميعٌ عَليمٌ"[3]

"سب اس لیے ہے کہ خدا کسی قوم کو دی ہوئی نعمت کو اس وقت تک تبدیل نہیں کرتا جب تک وہ خود اپنے تئیں تغیر نہ دیں"

معاشرے میں مذہبی تحریکیں کیوں پیدا ہوتی ہیں؟ اس کو دو وجوہات ہیں۔ ایک تو پس ماندگی، زوال، اور معاشرہ کا خرابیوں و برائیوں میں اس حد تک مبتلا ہو جانا کہ اس سے ہر فرد کی زندگی متاثر ہونے لگے۔ جب بھی کوئی معاشرہ اس حالت کو پہنچ جاتا ہے تو اس وقت اس بات کا اعادہ کیا جاتا ہے کہ صرف مذہب کی

[1] البقرہ: 124
[2] رعد: 11
[3] انفال: 53

بنیادی تعلیمات کے ذریعہ ہی ان خرابیوں کو دور کیا جا سکتا ہے۔ اس کی دلیلیہ دی جاتی ہے کہ جس طرح مذہب کے ابتدائی دور میں اس کی تعلیمات نے معاشرے میں تبدیلی کی تھی اور ایک مثالی معاشرہ مساوات کی بنیادوں پر قائم کیا تھا۔ وہ اب بھی ممکن ہے۔ اس دلیل کو ماضی کے شواہد سے تقویت دی جاتی ہے۔ تاریخی واقعات اس تحریک کو ایک نئی توانائی اور جذبہ دیتے ہیں۔ لہٰذا ابتدائی دور کے مثالی معاشرے کا خواب بار بار احیاء کی تحریکوں کو پیدا کرتا ہے۔ اس کی مثال خصوصیت سے نو آبادیاتی دور میں ملتی ہے کہ جب سامراجی قوتوں کے خلاف سیاسی اور سیکولر طاقتیں شکست خوردہ ہو گئیں تو اس وقت احیاء کی مذہبی تحریکوں نے اس نعرہ کے تحت سامراجی طاقتوں سے لڑائی لڑی۔ یہ لیبیا کی سنوسی تحریک ہو یا سوڈان کے مہدی سوڈانی کی پر جوش مہم ہو اور ہندوستا میں سید احمد شہید کی تحریک ہو۔ ان سب میں جو مشترک چیز تھی وہ ماضی کے مثالی معاشرے کا احیاء تھا۔ اور اس کی واپسی کے لئے لوگ ان کے ساتھ ہوئے۔ اس لئے احیاء کی تحریکیں تاریخ کے سنہری دور کو استعمال کر کے لوگوں کو اپنے حق میں ہموا بناتی ہیں۔

مذہبی اصلاحی تحریکیں اور مذہبی معاشی تحریکیں ان دونوں کے مقاصد، تنظیم، اور منشوروں میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اصلاحی تحریکیں اس بات پر زور دیتی ہیں کہ معاشرہ کے اندر تبدیلی لائی جائے اور افراد کو کردار کے لحاظ سے صالح بنایا جائے۔ اس مقصد کے لئے یہ عبادات۔ ذکر۔ مراقبہ۔ وعظ و تبلیغ کو استعمال کرتے ہیں۔ ان کے ہاں تنظیم کی رکنیت پر کوئی پابندی نہیں ہوتی ہے اور ان کے دروازے ہر ایک پر کھلے ہوتے ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ ان سے فیض یاب ہوں اس طرح یہ تحریکیں نیچے کی جانب سے ابھرتی ہیں اور اپنے اندر ایک عوامی کردار کو پیدا کرتی ہیں۔ ایسی تنظیموں میں لیڈر شپ کی بھی زیادہ اہمیت نہیں ہوتی ہے[1]

ان اصلاحی تحریکیوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ پہلے معاشرہ کو سدھارا جائے۔ جب معاشرہ سدھر جائے گا تو اس کے نتیجہ میں سیاسی و معاشی تبدیلیاں خود بخود آ جائیں گی۔ اس لئے عام طور سے یہ تحریکیں سیاست سے علیحدہ رہتی ہیں اور سیاسی جھگڑوں میں خود کو الجھانا پسند نہیں کرتی ہیں۔ ان کا استدال یہ ہوتا ہے کہ اس صورت میں وہ سیاسی حریفوں سے متصادم ہو جائیں گی اور اپنے کام کو پورا نہیں کر سکیں گی۔ اس کے برعکس دوسری تحریکوں کو ہم اصلاحی کہیں گے۔ کیونکہ یہ نہ تو احیاء کا نعرہ لگاتی ہیں اور نہ انقلاب کا بلکہ یہ موجودہ معاشرے میں کسی بنیادی تبدیلی کے بغیر اس میں اصلاح کی خواہش مند ہوتی ہیں۔ یہ مذہب کو جدید زمانے کے مطابق ڈھال کر اسے ماضی سے باہر نکال لاتی ہیں اور اس کی تعلیمات کو اپنے زمانہ کے مطابق کر کے ان تضادات کو ختم کرنے کی کوشش کرتی ہیں کہ جو بنیادی مذہب اور جدید تقاضوں میں ہوتا ہے۔

برصغیر کی اسلامی مذہبی تحریکیں:

شاہ ولی اللہ کی تحریک آخری عہد مغلیہ میں اس وقت شروع ہوئی جب کہ مغل خاندان اور امراء سیاسی زوال کے عمل سے گزر رہے تھے۔ مسلمان معاشرے میں شیعہ و سنی اختلافات پیدا ہو چکے تھے۔ فقہی مسلکوں کے درمیان کشیدگی کی فضا تھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سیاسی اقتدار کی جنگوں میں مذہب کا کوئی کردار نہیں رہا تھا۔ مسلمان ہندوؤں کی افواج میں شامل مسلمان حکمرانوں سے لڑ رہے تھے۔ اور ہندو مسلمانوں کے ساتھ ہندو حکمرانوں سے برسرپیکار تھے اس لئے شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کے دو پہلو تھے۔ ایک مسلمان معاشرہ کو روحانی طور پر ایک کیا جائے شیعہ سنی اور فقہی اختلافات کو دور کیا جائے۔ شریعت و طریقت کو آپس میں ملایا جائے اور مسلمانوں میں مذہبی روح کو بیدار کیا جائے۔ دوسرے ان کی سیاسی قوت کو جمع کر کے زوال کے عمل کو روکا جائے کہ جس

---

[1] مبارک علی ڈاکٹر تاریخ اور مذہبی تحریکیں تاریخ پبلیکیشن لاہور، سن اشاعت 2015 ص 18

سے وہ دو چار تھے اور انہیں اس قابل بنایا جائے کہ وہ دوبارہ سے حکومت کو سنبھال سکیں۔[1]

ان حالات میں بنگال میں حاجی شریعت اللہ (وفات 1840) نے فرائضی تحریک شروع کی۔ اس تحریک کا مقصد اسلام کی بنیادی تعلیمات کا احیاء اور مسلمانوں کو مشرکانہ رسومات سے دور کرنا تھا۔ اس کا اثر کسانوں کا شتکاروں اور دست کاروں میں اس لئے ہوا کہ وہ اس کے ذریعہ اپنے مسائل کو حل کرنا چاہتے تھے۔ اس تحریک نے اپنے پیروکاروں میں اتحاد کی خاطر ان میں برادرانہ جذبات کو پیدا کیا اس مقصد کے لئے خاص لباس وضع وقطع کو لازمی قرار دیا۔ اس تحریک کا نام 'فرائضی تحریک' اس لیے پڑا کہ اس کے ماننے والے اسلام کے عائد کردہ فرائض کی بجاآوری کا عہد کیے ہوئے تھے۔ اس لیے "فرائضی" کہلانے لگے۔[2]

معین الدین خان لکھتے ہیں:

> "حاجی شریعت اللہ فرائض کی ادائیگی پر بہت زور دیتے تھے اور ہندوانہ رسومات کو ترک کرا کے شعائرِ اسلام پر عمل کرانا چاہتے تھے۔ اس لیے آپ کی تحریک "فرائضی" کے نام سے موسوم ہو گئی"[3]

یہ ایک دینی وسیاسی تحریک تھی کہ جو ماضی کے مثالی معاشرہ کی واپسی کے لئے جدوجہد کر رہی تھی اور محروم طبقے اس کے ساتھ تھے کہ ان کا استحصال ختم ہو گا اور وہ اسلام کے ابتدائی دور کے معاشرے کو قائم کر کے خوشحالی کی زندگی گزار سکیں گے۔ کاشت کاروں کے لئے خصوصیات سے یہ نعرہ کہ "زمین خدا کی ہے". بڑا دلکش تھا۔ مزید ٹیکسوں کی ادائیگی سے انکار دستکار و کاشتکار دونوں کے لئے فائدہ مند تھا۔ حاجی شریعت اللہ کی وفات کے بعد ان کے لڑکے دودو میاں (وفات: 1862) کے پاس تحریک کی قیادت آئی مگر آہستہ آہستہ اس تحریک نے مزاحمت کے بجائے مفاہمت کو اختیار کیا اور انگریزی اقتدار کو تسلیم کرتے ہوئے اپنی اہمیت ختم کر لی۔

جس وقت سید احمد شہید نے اپنی تحریک کا آغاز کیا ہے یہ وہ وقت تھا کہ جب دہلی میں مغل بادشاہ تخت نشین تو تھا مگر اس کی سیاسی طاقت ختم ہو چکی تھی اور سیاسی اقتدار ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھوں میں جا چکا تھا۔ سید احمد شہید کی تحریک کے بھی دو پہلو تھے۔ اول وہ مسلمان معاشرے سے تمام غیر اسلامی اور ہندووانہ رسومات کا خاتمہ چاہتے تھے تاکہ ہندوستان کے مسلمان خالص اور بنیادی تعلیمات کی روشنی میں اپنا معاشرہ قائم کر سکیں۔ دوم اپنے اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے وہ برطانوی علاقے سے دور سرحد کی جانب جانا چاہتے تھے کہ وہاں بغیر کسی دخل اندازی کے ایک مثالی اسلامی معاشرہ قائم کر سکیں علی گڑھ اور دیوبند دونوں تحریکوں نے اپنے نظریات وافکار کے لئے تعلیم کا سہارا لیا تاکہ نوجوان نسل کو ذہنی طور پر تیار کیا جا سکے۔ دیوبند تحریک نے متوسط طبقہ کے لوگوں، خصوصیت کے ساتھ علماء گھرانہ کے افراد کو متاثر کیا کیونکہ یہ وہ لوگ تھے کہ جو انگریزی اقتدار کے بعد اپنے منصب وعہدے کھو چکے تھے۔ اب مدرسوں سے فارغ التحصیل ہو کر ان کے لئے مسجدوں ومدرسوں میں اساتذہ وفقہاء کی جگہیں تھیں کہ جہاں وہ مسلمانوں کی بدلتے حالات میں دین ومذہب کی روشنی میں راہنمائی کر سکتے تھے۔[4]

ان دو تحریکوں کے ساتھ تیسری تحریک احمد رضا خاں کی بریلوی تحریک تھی۔ احمد رضا خاں کا موقف یہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے جو رسومات وروایات اختیار کر لی ہیں۔ اب انہیں اسی حالت میں رہنے دیا جائے اور ان کے مذہبی جذبہ کو برقرار رکھا جائے۔ اگر ان رسومات کے خلاف مہم

---

[1] شیخ، محمد اکرام، رود کوثر، ادارہ ثقافت اسلامیہ 1958، ص 598

[2] محمد خالد مسعود، اٹھاویں صدی عیسوی میں برصغیر میں اسلامی فکر، ادارہ تحقیقات اسلامیہ بین الاقوامی یونیورسٹی اسلام آباد، سن اشاعت 2008، ص 7

[3] معین الدین احمد خان A History of the Faraidi Movement in Bengal، سن اشاعت 1955، ص 11

[4] محمد خالد مسعود، مقدمہ اٹھاویں صدی عیسوی میں برصغیر میں اسلامی فکر، ادارہ تحقیقات اسلامیہ بین الاقوامی یونیورسٹی اسلام آباد، سن اشاعت 2008، ص 7

چلائی گئی تو اس کے نتیجہ میں مسلمان معاشرہ میں انتشار پھیلے گا.بریلوی تحریک کسی مزاحمت کی قائل نہ تھی وہ.برطانوی دور کے حالات میں مسلمان معاشرے کے اتحاد کو.برقرار رکھنا چاہتی تھی۔

ہندو مذہبی تحریکیں:

ہر مذہب وقت کے ساتھ اپنی شناخت بدلتا رہتا ہے۔ ہندومت بھی اس عمل سے گذرا ہے۔ اس پر مزہبی اسکالرز میں کافی بھث ہوئی ہے کہ بنیادی طور پر ہندمت کی کوئی ایک شکل یا صورت نہیں ہے۔ اس کو ایک منظّم حیثیت دینے کا سلسلہ موجودہ دور کی پیداوار ہے کہ جب یہ جدید مذاہب سے متاصدم ہوا۔ اس وقت اس بات کو محسوس کیا گیا کہ ہندومت کو بھی دوسرے مذاہب کی طرح سے ایک منظّم شکل دی جائے اور اس کی بنیاد پر ایک ہندو قوم کی تعمیر کی جائے۔ ہندومت میں بھی دوسرے مذاہب کی طرح وقت اور ماحول کے لحاظ سے کئی تحریکیں اٹھیں۔ خصوصیت کے ساتھ بدھ مت اور جین مت کی مذہبی تحریکیں اس لحاظ سے اہم ہیں۔ کیونکہ انہوں نے برہمن ازم کے خلاف بغاوت کرتے ہوئے، ہندومت کی "مین باڈی" سے علیحدگی اختیار کی۔ کسی بھی مذہب میں اس علیحدگی کی سب سے.بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ جب بھی "اصل مذہب" خود کو تبدیل کرنے سے انکار کردے۔ اور اس میں اصلاح کی کوئی گنجائش نہیں رہے تو اس صورت میں علیحدگی ہی وہ راستہ رہ جاتا ہے کہ جس کے تحت یا تو وقت کے تقاضوں کے تحت نیا عقیدہ تشکیل دیا جاتا ہے یا اصل مذہب کو رد و بدل کے بعد پیش کیا جاتا ہے۔ اس لئے بدھ اور جین مذاہب یہ دونوں ہندومت میں.برہمن ازم کے خلاف بغاوت تھے۔[1]

بھگتی تحریک:

.برصغیر کے مسلم فکر کے ارتقاء میں بھگتی تحریک کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ بنیادی طور پر تحریک ہندوستان کی دو عظیم تہذیبوں کے مابین ترکیب پیدا کرنے کی شعوری کوشش کے طور پر وجود میں آئی تھی لیکن یہ اپنی قسم کی اوّلین تحریک نہیں تھی۔ اس سے قبل ایسی کئی خودرو تحریکیں.برصغیرک معروضی صورتِ حال سے جنم لے چکی تھیں۔ اور ان کے نتیجے کے طور پر نچلے طبقات کی سطح پر ہندو مسلم ترکیبی ثقافت جنہم لے رہی تھی۔ اس عمل کا آغاز ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس عمل کے ابتدائی دور میں سندھ کے نومسلموں نے عرب عہد حکومت میں اپنے سابقہ مذہبی دیوتاؤں کو اسلامی نام عطا کردیئے تھے۔ بعد ازاں یہ سلسلہ دیگر علاقوں میں پھل گیا۔[2] اس تحریک کے بارے میں ڈاکٹر قمر رئیس لکھتے ہیں:

> ”برہمو سماج کی اس تحریک نے مذہبی تعطل، قدامت پسندی اور تنگ نظری کے اس طلسم کو توڑنے میں مدد دی جس نے ہندوستان کی تمدنی ترقی کی راہیں مسدود کر رکھی تھیں ان کی انتھک کوششوں سے ستی کی رسم ختم ہوئی۔۔۔ اور ہندو سماج میں عورتوں کی زبوحالی کے خلاف آواز حرکت پیدا ہوئی سماج کی ان سرگرمیوں سے تعلیم یافتہ طبقے میں بیداری کا ایک صالح احاس پیدا ہوا اور یہی احساس ہندوستان کے نشاتہ الثانیہ کا سنگِ میل ہے“[3]

ہندومت میں ذات پات کی سختیوں، اور سماجی تفریق کے خلاف چھ سے ساتویں صدیوں میں جنوبی ہند میں بھگتی تحریک اٹھی۔ اس میں نجات کے لئے عبادت

---

[1] مولانا محمود الرشید، مطالعہ مذاہب، مکتبہ آب حیات مکی مدنی پرنٹر، لاہور، ص: 60

[2] قاضی جاوید، .برصغیر میں مسلم فکر کا ارتقاء ادارہ ثقافت پاکستان لاہور، طبع اول 1977، ص69

[3] پریم چند، ہندووں کا تنقیدی مطالعہ، سر سید بک ڈپو علی گڑھ، طبع چہارم، 1947 ص76

اور خدا سے لگاؤ کی تعلیم تھی۔ معاشرہ میں ذات پات کو ختم کر کے مساوات پر زور دیا گیا تھا اور یوں فرد کو سماجی تسلط سے آزاد کر دیا گیا۔ تیرھویں صدی میں یہ تحریک شمال ہندوستان میں آئی اور یہاں کی نچلی ذاتوں کو ہندومت کے ذات پات کے نظام سے آزاد کر کے انھیں معاشرہ میں باعزت مقام دیا۔ اس لئے یہ تحریک نچلی ذاتوں میں تو مقبول ہوئی مگر اعلی ذاتیں اس سے دور رہیں۔ بھگتی تحریک نے نہ صرف مساوات پر زور دیا بلکہ دوسرے مذاہب سے تصادم کے بجائے ان سے مفاہمت کی پالیسی کو اختیار کیا۔[1]

رام موہن رائے (وفات: 1833ء) نے برہمو سماج کی تحریک شروع کی:

یہاں خاص طور پر اس کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ یہ ایک اصلاحی تحریک تھی، انقلابی نہیں، اس کا مقصد نئے حالات کے تحت مذہبی عقیدوں کو بدلنا تھا۔ اس کا مقصد سیاسی نہیں تھا اور نہ ہی اس کے مقاصد میں سیاسی اقتدار حاصل کرنا تھا۔ ہندوستان کے اسلامی معاشرہ میں نوآبادیاتی نظام کے رد عمل میں فرائضی تحریک یا جمادی تحریک فوجی اور سیاسی تحریکیں تھیں کہ جن کا مقصد مذہبی ریاست کا قیام تھا۔

اس کے بعد دوسرے مرحلہ پر سر سید کی ترقی پسند اسلامی تحریک اور دیوبند کی احیاء کی تحریک تھی کہ جو معاشرے کو اپنے اپنے نقطہ ہائے نظر سے تشکیل دینا چاہتے تھے۔ ہندومت میں اس طرح سے جو ابتدائی تحریکیں انھیں وہ اصلاحی تھیں۔ دوسرے مرحلہ پر جا کر یہ اصلاحی سے زیادہ سیاسی ہوئیں اور جب انگریزی اقتدار کے خاتمہ کا وقت آیا تو یہ پر تشدد ہوئیں۔ برہمو سماج میں بت پرستی کے خلاف آواز اٹھائی گئی اور عقیدہ توحید پر زور دیا گیا۔ انہوں نے پجاریوں کے طبقے، پیچیدہ رسومات اور توہمات کو فضول قرار دیا۔ پجاریوں کی بجائے براہ راست مذہبی کتابوں کی تعلیم کو رائج کیا گیا تاکہ مذہبی معاملات میں پجاریوں کی بجائے ان کتابوں سے اتھارٹی لی جائے۔ جدید زمانہ میں پولیس کی وجہ سے اب یہ کتابیں چھپنے لگیں اور ہر فرد کی پہنچ میں آگئیں۔ جس کی وجہ سے علم پر سے براہمن کی اجارہ داری ختم ہوگئی۔ برہمو سماج میں وید کی تعلیمات سے زیادہ اپنشد کی تعلیمات پر زور دیا گیا ہے۔ کیونکہ ان کی مدد سے عیسائیت اور مغرب کے قریب آیا جا سکتا تھا۔ جو کہ مغربی ہندو تعلیم یافتہ طبقہ کی ضرورت تھی۔ اس لئے برہمو سماج دوسرے مذاہب سے تصادم کے بجائے مفاہمت کے راستہ تلاش کر رہا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ہندو مذہبی تنگ نظری میں نہ رہیں، بلکہ اس سے نکل کر کھلی فضا میں آئیں اور دوسرے سب کے لوگوں سے اپنے رابطے و تعلقات استوار کریں۔[2]

برہمو سماج نے خاص طور سے ہندومت میں عورت کی پس ماندگی کو دور کرنے کی جدوجہد کی۔ کیونکہ ہر معاشرے میں عورت تہذیب و ثقافت کی علامت ہوتی ہے۔ اس لئے اہل مغرب کا زبردست اعتراض یہ تھا کہ ہندو معاشرہ اس لئے پس ماندہ ہے۔ کیونکہ اس کی عورت پس ماندہ ہے۔ اور اس کے معاشرہ میں کوئی مقام نہیں۔ اس لئے برہمو سماج نے ستی کے خلاف زبردست مہم چلائی، بیوہ عورتوں کی شادی پر زور دیا اور عورتوں کی تعلیم پر توجہ دی تاکہ عورت معاشرہ میں خود کو مفید بنا سکے۔ ہندو معاشرے کی ایک اور اہم خرابی ذات پات کی تفریق تھی کہ جس کی وجہ سے معاشرہ بٹا ہوا تھا۔ اس لئے برہمو سماج نے مختلف ذاتوں میں سماجی تعلقات بڑھانے کی تبلیغ کی اور خاص طور سے مختلف ذاتوں میں شادی بیاہ کو سراہا۔[3] برہمو سماج نے عیسائی مشنریوں سے بھی بہت کچھ سیکھا کہ جب تک کسی تحریک کو باقاعدہ سے منظم نہیں کیا جائے۔ اس کے اصولی و قواعد نہیں بنائے جائیں اور عملی طور پر فلاح و بہبود کے کام نہ کئے

---

[1] موج کوثر، ص 61

[2] عزیز احمد صدیقی، مندر مذہب کی تاریخ اور ھندی مسلمان ادارہ ثقافت پاکستان لاہور ص 6

[3] مولانا انیس احمد فلاحی مدنی، مذاہب عالم ایک تقابلی مطالعہ، گنج شکر پریس، مکتبہ قاسم العلوم، لاہور، ص ۱۷

جائیں، محض الفاظ اور تبلیغ سے کچھ نہیں ہوتا ہے۔ اس لئے انہوں نے فلاحی کاموں پر پوری توجہ دی۔ یتیم خانے، ہسپتال اور اسکول کھلے، تاکہ ان اداروں کے ذریعہ نہ صرف وہ اپنے معاشرہ میں لوگوں کی خدمت کریں بلکہ ان عملی کاموں کی مدد سے اپنے مشن کو بھی کامیاب بنائیں۔

برہمو سماج کی تحریک کا زیادہ اثر بنگال ہی میں رہا۔ ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں یہ زیادہ مقبول نہیں ہو سکی۔ مگر اس نے نوآبادیاتی دور کے ابتدائی چیلنجوں کے تحت خود کو منظّم کیا اور بنگال کے متوسط اور تعلیم یافتہ طبقے کو وہ نظریات دئے کہ جن کی بنیاد پر انہوں نے خود کو بدلتے ہوئے حالات میں کارآمد بنایا۔

سکھوں کی مذہبی تحریکیں:

سکھوں میں نوآبادیاتی دور میں دو اہم مذہبی تحریکیں اٹھیں۔ اس کا پس منظر یہ تھا کہ جب انگریزوں نے 1849ء میں پنجاب پر قبضہ کر لیا تو یہ سکھوں کی پہلی اور آخری حکومت کا خاتمہ تھا۔ اس سیاسی اقتدار کے کھونے کا اثر ان پر زبردست ہوا۔ لیکن جب 1857ء میں سکھوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا اور شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ مغل حکمران خاندان سے جو تاریخی اختلافات رکھتے تھے اس کی وجہ سے انہوں نے اس جنگ میں انگریزوں کی حمایت کی۔ اس حمایت کی وجہ سے انگریز حکومت نے سکھوں کی سرپرستی کی۔ سکھوں کی جانب سے اس خدشہ کا اظہار کیا گیا اگر سکھ مذہب کی حفاظت نہیں کی گئی تو یہ ان کے سیاسی اقتدار کی طرح زوال پذیر ہو کر ہندومت میں ضم ہو جائے گا۔ انگریز سکھوں کی حفاظت اور سرپرستی اس وجہ سے بھی چاہتے تھے کہ ان شکل میں انہیں بہترین فوجی رہے تھے۔[1] خود سکھوں کو اس وقت اپنے ختم ہونے کا خطرہ محسوس ہوا کہ جب آریہ سماج نے شدھی تحریک شروع کی اور کچھ نچلی ذات کے سکھوں کو ہندو بنایا۔ اس دوران ہندوؤں کی جانب سے یہ کہا گیا کہ سکھ علیحدہ سے کوئی مذہبی جماعت نہیں بلکہ یہ ہندو ہی ہیں۔ اس قسم کے اعلانات اس خطرہ کے ساتھ ساتھ سکھوں کو دوسرا خطرہ عیسائی مشنیروں سے تھا کہ جنھوں نے پنجاب میں اپنی تبلیغی سرگرمیوں کو تیز کر دیا تھا۔ اور تیزی کے ساتھ نچلی ذات کو لوگوں کو عیسائی بنا رہے تھے۔ یہ وہ خطرات تھے کہ جن میں اپنے سیاسی اقتدار سے محروم ہونے کے بعد، سکھوں نے خود کو پایا۔ اپنے مذہب اور اپنی جماعت کو بچانے کے لئے ان میں دو مشہور مذہبی تحریکیں اٹھیں۔ ان میں ایک ترنکاری تھی۔ اور دوسرے نامدھاری۔ ترنکاری تحریک کا مقصد تھا کہ سکھوں کی شناخت کو مذہبی بنیادوں پر مضبوط کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے ضروری تھا کہ ان کے کردار کی اس طرح تشکیل کی جائے کہ وہ دوسرے مذاہب کے لوگوں سے ممتاز نظر آئیں۔ اس کے سربراہ بابا دیال داس (وفات: 1853) تھے کہ جنھوں نے تمام دیوی دیوتاؤں کی پوجا سے منع کیا۔ اور برہمنوں کی رسومات کو رد کیا۔ انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ ان کے پیروکار روزمرہ کے کاروبار اور معاملات میں ایمانداری سے کام لیں۔ انہوں نے عورتوں کے حقوق پر بھی زور دیا۔[2]

یہ ایک اصلاحی تحریک تھی کہ جس کا مقصد یہ تھا کہ سکھ کردار کو مضبوط بنایا جائے تاکہ وہ دوسرے مذاہب کا مقابلہ کر سکے۔ انہوں نے بابا نانک کی پالیسی امن و مفاہمت کو اختیار کیا اور تشدد سے پرہیز کیا۔ اس کے مقابلہ میں نامدھاری تحریک جسے بابا رام سنگھ (1855) نے شروع کیا ان کا آئیڈیل بابا نانک نہیں تھے بلکہ گرو گوبند سنگھ تھے کہ جو دوبارہ آئیں گے اور سکھ ریاست قائم کریں گے۔ سکھوں کی قوت اور طاقت کو مجتمع کرنے اور ان میں اتحاد پیدا کرنے کی غرض سے انہوں نے ان کے لباس اور ظاہری صورت میں علیحدگی پر زور دیا۔ گداگری کے بھی مخالف تھے کیونکہ اس سے کردار کی بلندی متاثر ہوتی تھی۔ ان کے یہاں عورت کے سماجی مقام کو بھی بلند کیا گیا ہے۔[3]

---

[1] طاہر منصور فاروقی، دنیا کے قدیم وجدید مذاسب ادارہ تحقیات، ص159

[2] Narang GC, Transformation of Sikhism New Delhi 1956, Pg- 278

[3] مبارک علی ڈاکٹر تاریخ اور مذہبی تحریکیں تاریخ پبلیکیشن لاہور، سن اشاعت 2015 ص 78

سکھوں کے ہاں مذہب ان کی شناخت بن گیا اور وہ اس خطرے کے تحت کہ کہیں ہندومت انھیں اپنے اندر ضم نہ کرے۔ اپنی اس مذہبی شناخت میں پناہ لیتے گئے۔ اس کی وجہ سے ان کی سیاست بھی مذہب کے تابع ہو گئی۔ 1920ء میں سیاسی و مذہبی جماعت اکالی دل اس پس منظر میں منظّم ہوئی۔ اب گولڈن ٹیمپل ان کے مذہب کی علامت بن گیا تو اکالی تخت سیاسی قوت کا۔ اپنی علیحدہ شناخت کو مضبوط کرنے کے لئے ان میں 1923ء میں گردواری تحریک چلی۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ گولڈن ٹیمپل، اکال تخت اور دوسرے سکھ گردواروں پر جو ہندو مہنت اور پجاری قابض ہیں، انھیں بے دخل کیا جائے۔ اور انھیں سکھوں کی عملداری اور نگرانی میں لایا جائے۔ اس تحریک نے 1923ء تک گردواروں اور سکھ زیارت گاہوں کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ اس کے بعد سے سکھ ایک علیحدہ مذہبی شناخت کے ساتھ ابھرے اور اکالی دل نے ان کے سیاسی عزائم کو پورا کرنے کا پروگرام بنایا۔[1]

سکھ مذہب کا عسکری پہلو کرپان میں ملفوف ہوتا ہے۔ یہ چھوٹی سی نمائشی تلوار بہادری اور وقار کی علامت ہے۔ اور اپنے پہننے والے کو مسلسل پر عزم رکھتی ہے۔ کہ سکھ مذہب، اس کی اخلاقی اقدار کا تحفظ کرنا اور مظلوموں کی جبر و تشدد سے بچاتا ہے۔ سکھ مذہب متعدد مرتبہ اپنی جنم بھومی پنجاب میں قوم پرست سیاسی تحریکوں سے وابستہ رہا ہے۔ یہ علاقہ مذہبی تنازعات کی وجہ سے متاثر ہوتا رہا ہے۔ اور سکھوں کو ناگزیر طور پر ان میں کھینچا گیا ہے۔ پنجاب میں 1799ء میں مختصر سے عرصہ کے لئے سکھ سلطنت قائم ہوئی جس کو انگریزوں نے 1849ء میں تحلیل کر دیا۔

اکالی تحریک:

1920ء کے عشرہ میں سکھ اصلاحی تحریک ''اکالی'' کے قیام اور پھر 1966ء میں اکالی دل کے نام سے سیاسی جماعت بننے کے بعد پنجاب میں خود مختار سکھ ریاست کے مطالبات ہوتے رہے ہیں۔ جہاں سکھوں اور ہندوؤں کے درمیان پر تشدد واقعات ہوئے اور پھر پاکستان اور ہندوستان میں مسلسل کشیدگی رہی ہے۔ پنجاب کے باہر سکھ تارکین وطن عام طور پر معاشرے کا حصہ بنے رہتے ہیں۔

ایک جدید ضابطہ حیات ہم عصر سکھ برادری کے لئے 1950ء میں سکھ رہت مریادہ کی شکل میں شائع کیا گیا جو ذاتی اور سماجی زندگی کے لئے رہنمائی دیتا ہے۔ جس میں تقریبات، رسوم، اور عبادات شامل ہیں۔ تاہم جس طرح گرونانک نے ابتدائی تعلیمات میں کہا تھا۔ خدا کے لئے خود کو وقف کرنا اور سماجی سطح پر ایک ذمہ دارانہ طرزِ حیات اپنانا سکھ مت میں مذہبی رسومات اور احترام سے زیادہ اہم ہیں۔ اس کی عکاسی گردوارہ میں ہوتی ہے۔ جو عبادت گاہ ہونے کے ساتھ ساتھ سکھ برادری کا مرکز ہے۔ گروؤں نے عبادت کا کوئی مخصوص طریقہ کار وضع نہیں کر رکھا۔ البتہ علی الصبح دعا کرنے کا ایک معمول ہے۔ جس میں مل منترا پڑھا جاتا ہے۔ اسے گرونانک نے خدا کی طرف دھیان لگانے کے لیے مرتب کیا تھا سے کہیں بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ گردوارہ میں پڑھنا ضروری نہیں ہوتا چنانچہ مل منترا اور اس کے ساتھ گروہ گرنتھ صاحب نے گربانی پڑھنے کا عمل کوئی بھی ہو سکتا ہے۔[2]

عیسائیکی مذہبی تحریکیں:

370 کے قریب عیسائیت دو بڑی سلطنتوں میں بٹ چکی تھی: ایک ایسٹرن رومن ایمپائر کہلاتی تھی اور اس کا مرکز قسطنطنیہ (موجودہ استنبول) تھا اور اس کے سب سے بڑے مزہبی پیشوا کو بطریق (Patriarch) کہتے تھے جبکہ دوسری ویسٹرن رومن ایمپائر کہلاتی تھی اور کا مرکز اٹلی کا شہر روم تھا۔ جس کے پیشوا کو پوپ کہا جاتا۔ پاپائیت کا آغاز دراصل اسی دور میں ہوا تھا۔ ان دونوں سلطنتوں کے مابین زبان کے فرق کی وجہ سے کئی مذہبی تنازعات بھی پیدا ہوئے۔ جس کی

---

[1] Narang GC, Transformation of Sikhism New Delhi Pvt 1956 Pg-No 280

[2] مبارک علی ڈاکٹر تاریخ اور مذہبی تحریکیں تاریخ پبلیکیشن لاہور، سن اشاعت 2015، ص 78

وجہ سے بعد میں 1045 میں دونوں کلیسا باقاعدہ طور پر ایک دوسرے کے علیحدہ ہو گئے۔ اس طرح سے عیسائیوں کے دو بڑے فرقے ایسٹرن آرتھوڈوکس اور رومن کیتھولک وجود میں آئے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ویسٹرن ایمپائر شمالی یورپ کے وحشی قبائل کے حملوں کی تاب نہ لا کر زوال پزیر ہو گئی۔ البتہ ایسٹرن رومن ایمپائر طویل عرصے تک زندہ رہی۔

گریگوری (Gregory 604-540) پوپ بنے۔ چھٹی صدی عیسوی کے اس دور سے لے کر 1500 تک کے دور کو اہل مغرب دور تاریک (Dark Ages) "کہتے ہیں۔ گریگوری نے رومی کلیسا کو انتہائی مستحکم کیا اور پاپائیت کے نظام اور اس کے اختیارات کو بھی قوت حاصل ہوئی۔ حتیٰ کہ سیاسی معاملات میں بھی کسی قسم کی پیش رفت پوپ کی اجازت کے بغیر تصور نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس زمانے میں اسلام جزیرہ نما عرب سے ایک بڑی طاقت بن کر اٹھا اور مسلمانوں نے ایسٹرن رومن ایمپائر کے ایشیائی اور افریقی مقبوضات کو فتح کر لیا۔ مسلمانوں کے ساتھ جنگوں میں زیادہ نقصان عیسائیوں کا ہوا اور ایسٹرن رومن ایمپائر صرف ترکی اور یونان کے چند علاقوں تک محدود ہو کر رہ گئی۔ تاہم عیسائی مبلغین نے مغرب کی جانب پیش قدمی جاری رکھی۔ اور ان کی دعوت کے نتیجے میں شمالی اور مغربی یورپ کی اقوام، جو ابھی وحشی تھی عیسائیت کے دائرے میں ڈاخل ہوتی چلی گئیں۔ اس طرح سے عیسائیت یورپ کا غالب مذہب بن گیا۔[1]

صلیبی جنگیں(Crusades):

پوپ اربن ثانی (1099-1042) کی سرپرستی میں صلیبی جنگیں بھی 1095 سے 1291 تک کے اسی عرصے میں ہوئی۔ فلسطین بالخصوص بیت المقدس پر عیسائی قبضہ بحال کرنے کے لیے یورپی کلیسا نے کئی جنگیں لڑیں۔ جنھیں تاریخ میں صلیبی جنگوں (Crusades) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ جنگیں فلسطین اور شام کی حدود میں مسلمانوں کے خلاف لڑی گئیں۔ صلیبی جنگوں کا یہ سلسلہ طویل عرصہ تک جاری رہا۔ اور اس دوران نو بڑی جنگیں لڑی گئیں۔ جس میں لاکھوں انسان قتل ہوئے۔ شروع میں عیسائیوں کو فتح حاصل ہوئی اور انہوں نے 1099 میں یروشلم کو فتح کر لیا۔ اس کے بعد موجودہ شام، لبنان اور فلسطین کے علاقوں میں متعدد عیسائی ریاستیں قائم ہوئیں۔ لیکن مسلمان ایک بار پھر صلاح الدین ایوبی کی قیادت میں متحد ہوئے۔ اور انہوں نے عیسائیوں کے پے در پے شکستیں دے کر واپس یورپ جانے پر مجبور کیا۔ 1187 میں یروشلم واپس آگیا اور تیرہویں صدی کی ابتداء میں شام میں عیسائی حکومتوں کا خاتمہ ہو گیا۔[2]

اس عہد کی دوسری خصوصیت صلیبی جنگیں ہیں جنہیں عیسائی مورخین کروسیڈ (Crusade) کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں بیت المقدس اور شام فلسطین کا علاقہ مسلمانوں کے ہاتھ فتح ہو گیا تھا۔ اس وقت تو عیسائی دنیا کے لیے اپنا دفاع ہی ایک زبردست مسئلہ تھا۔ اس لئے وہ آگے بڑھ کر دوبارہ ان مقدس علاقوں پر قبضہ کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ البتہ جب مسلمانوں کی طاقت کا بڑھتا ہوا سیلاب کسی حد پر رکا اور مسلمانوں میں کسی قدر کمزوری آئی تو عیسائی بادشاہوں نے اپنے مذہبی پیشواؤں کے اشارے پر بیت المقدس کو دوبارہ حاصل کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ یہ جنگیں سلجوقی ترکوں اور ایوبی سلاطین کے خلاف لڑی گئیں۔ ان جنگوں سے پہلے مذہبی جنگ یا کروسیڈ کا کوئی تصور عیسائی مذہب میں موجود نہ تھا۔ لیکن) میں پوپ اربن دوم نے کلیئر مونٹ کی کونسل میں یہ اعلان کر دیا کہ کروسیڈ مذہبی جنگ ہے۔ سی، پی، ایس کلیرک اپنی تاریخ کلیسا میں اس اعلان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> "لوگوں کو ترغیب دینے کے لیے اربن نے یہ عام اعلان کر دیا کہ جو شخص بھی اس جنگ میں حصہ لے گا اس کی مغفرت یقینی ہے۔ اور محمد (صلعم) کی طرح اس نے بھی وعدہ کیا کہ جو لوگ اس جنگ میں مریں گے وہ سیدھے جنت میں جائیں گے اس طرح سات کروسیڈ

---

[1] مائیکل کوگان، مترجم طاہر منصور فاروقی، دنیا کے قدیم وجدید مذاہب، ادارہ تخلیقات، لاہور، ص 378
[2] حافظ محمد شارق، اسلام اور مذاہب عالم، تاریخ پبلیکیشن، ص 59

لڑے گئے جن میں آخر کار عیسائیوں کو سلطان صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں بری شکست ہوئی ہے"

نفاق عظیم(Great Schism):

تاریخ عیسائیت کی ایک اصطلاح ہے۔ اس سے مراد مشرق اور مغرب کے کلیساؤں کا وہ زبردست اختلاف ہے جس کی بنا پر مشرق کلیسا ہمیشہ کے لیے کیتھولک چرچ سے جدا ہو گیا۔ اور اس نے اپنا نام بھی بدل کر "دی ہولی آرتھوڈوکس چرچ" (The Holy Orthodox Church) رکھ لیا۔ نفاق عظیم کے اسباب بہت سے ہیں مگر ان میں سے اہم مندرجہ ذیل ہیں:

اس علیحدگی کی پہلی وجہ تو مشرقی اور مغربی کلیساؤں کا نظریاتی اختلاف تھا۔ مشرقی کلیسا کا عقیدہ یہ تھا کہ روح القدس کا اقنوم صرف باپ کے قنوم سے نکلا ہے۔ اور بیٹے کا اقنوم اس کے لیے محض ایک واسطے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور مغربی کلیسا کا کہنا ہے کہ روح القدس کا اقنوم باپ اور بیٹے دونوں سے نکلا ہے۔ دوسرے مشرقی کلیسا کا خیال یہ تھا کہ بیٹے کا رتبہ باپ سے کم ہے۔ اور مغربی کلیسا کا اعتقاد یہ تھا کہ دونوں بالکل برابر ہیں۔ مشرقی کلیسا اہل مغرب پر یہ الزام لگاتا تھا کہ انہوں نے اپنے عقیدے سے کو ثابت کرنے کے لیے نیقیادی کونسل کے فیصلے میں بعض الفاظ اپنی طرف سے بڑھا دیئے ہیں جو اصل فیصلے میں موجود نہ تھے۔

بہت سے مصلحین نے حالات کی اصطلاح کی کوشش کی۔ ان لوگوں میں ویکلف کا نام سر فہرست ہے جو کلیسا کی ایجاد کردہ بدعتوں کا دشمن تھا۔ اور نیک و پرہیزگار پاپاؤں کے انتخاب کا داعی، اسی نے سب سے پہلے بائبل کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا۔ 1358 میں شائع ہوا، حالانکہ اس سے پہلے بائبل کا کسی اور زبان میں ترجمہ کرنا ایک سنگین جرم سمجھا جاتا تھا۔ اسی کی تعلیمات سے متاثر ہو کر اس کے بعد جان ہس (John Huss) اور جیروم (Jerome) اصلاح کے لیے کھڑے ہوئے۔ لیکن ابھی ان اصلاحات کے لیے فضا سازگار نہ تھی۔

پاپاؤں کے افتراق اور نفاق عظیم کو ختم کرنے کے لیے (1490) میں کونسل پیسا (Council of Pisa) بلائی گئی جس میں اسّی بشپ شریک ہوئے۔ اور انہوں نے دونوں حاسد پاپاؤں کو معزول کر کے الیگزینڈر پنجم کو پوپ منتخب کیا۔ اور نتیجہ یہ نکلا کہ کلیسا میں دو کے بجائے تین پوپ ہو گئے۔ اور کلیسا کے افتراق میں اور اضافہ ہوا۔ بالآخر نومب 1414 میں کانسٹنس کے مقام پر ایک کونسل بلائی گئی جس میں "نفاق عظیم" کا تو خاتمہ ہوا۔ لیکن اسی کونسل میں جان ہس کی اصلاحی تعلیمات کو اتفاق بدعتی قرار دے دیا گیا۔ اس کے نتیجے میں ہس اور اس کے شاگرد جیروم کو زندہ جلا دیا گیا۔ نتیجہ یہ کہ پاپائیت کی اخلاق اور مذہبی بدعنوانیاں بدستور برقرار ہیں۔[1] لیکن جان ہس کی تحریک بیداری کی تحریک تھی۔

یورپ کی بیداری کا دور اور پروٹسنٹنٹ ازم:

اس دوران جنگوں میں بھی عیسائی عوام کو بالجبر بھیجا جاتا گھا۔ اور ایک نیا رواج معافی نامہ تھا۔ جس کی ابتداء یوں ہوئی کہ پوپ اربن دوم نے یہ اعلام کیا کہ جو لوگ صلیبی جنگوں میں شریک نہیں ہو سکتے وہ اپنی طرف سے کسی اور کو بھیج دیں اس کے بدلے انہیں معافی نامہ دیا جائے گا۔ جو ان کے لیے یقینی نجات کا ذریعہ ہو گا۔ لیکن بعد ازاں پوپ لیو دہم (1521-1475) تک یہ رواج یہ صورت اختیار کر گیا کہ معافی نامے باقاعدہ ایجنسیوں پر فروخت ہونے لگے۔ ہر ایک گناہ کے لیے الگ الگ معافی نامہ ہوتا تھا۔ جس شخص کا جی چاہتا وہ گناہ کر کے پادریوں سے معافی نامے حاصل کر لیتا۔ اس کے نتیجے میں عیسائی دنیا میں اخلاقی انحطاط پیدا ہوا جس کی سرپرستی مذہبی علماء کر رہے تھے۔[2]

---

[1] محمد تقی عثمانی مولانا، عیسائیت کیا ہے، ادارہ اشاعت، ص 74

[2] حافظ محمد شارق، اسلام اور مذاسب عالم، ص59

علمی اعتبار سے بھی اس وقت عیسائیوں پر مظالم ڈھائے جا رہے تھے۔ کوئی بھی شخص دین کی تشریح و توضیح پوپ کے خلاف سائنسی و عقلی انداز میں کرتا تو اسے سخت سزائیں دی جاتیں۔ عیسائیت کے کئی قدیم فرقے اسی دور میں صفحہ ہستی سے مٹ گئے۔ 1478 میں احتساب (Inquisition) کی مجلس بی اسی مقصد کے تحت قائم کی گئی تھی کہ جس شخص پر بھی شبہ ہو کہ وہ دین میں اپنی عقل سے کام لیتا ہے۔

اسے گرفتار کر کے زندہ جلا دیا جائے۔ معروف سائنسدان گلیلیو (Galileo 1564-1642) کو اس گناہ کی پاداش میں توبہ کرنے پر مجبور کیا گیا کہ وہ اس بات کے قائل تھے کہ زمین سورج کے گرد گردش کرتی ہے۔ اس کے برعکس کلیسا کا نظریہ یہ تھا کہ سورج زمین کے گرد گھومتا ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق تین لاکھ چالیس ہزار کوگوں کو اس جرم کی پاداش میں مختلف نوع کی سزائیں دی گئیں۔ یہ قانون بھی 1515 میں پاس کیا گیا کہ کوئی بھی کتاب کلیسا کی منظوری کے بغیر شائع سنگین کرنا جرم ہے۔ ان سب مظالم کی وجہ سے ایک طرف کلیسا کے خلاف عوام میں نفرت کا جذبہ بڑھنے لگا تو دوسری طرف بہت سے لوگوں میں یہ خیال بھی پیدا ہوا کہ مذہب اور پر اتر آئے تھے۔ لیکن ان تحریکوں کے اثر سے لوگ گلیسا سے دور ہوتے جا رہے تھے۔ اس رجحان کو دیکھتے ہوئے کیتھولک کلیسا کے بعض مخلصین نے یہ کوشش کی کہ چرچ میں اصلاح کی جائے۔ اسی کوشش کے لیے آسٹریا کے مقام ٹرنٹ پر 1545 اور 1552 میں کونسلز کا انعقاد ہوا۔ جس میں بنیادی ایجنڈا یہ قرار دیا گیا کہ دونوں کلیساؤں کے اختلاف کو ختم کیا جائے اور عوام کو دوبارہ کلیسا سے جوڑا جائے۔ اگرچہ کلیساؤں میں اختلاف کوششوں کے باوجود ختم نہ ہو سکے۔ اس کونسل میں پوپ کے اختیارات کو برقرار رکھا گیا تاہم انہوں نے پادریوں کی زندگیوں کو اخلاقی طور پر اچھی اور پاک بنانے کے لیے اصول مرتب کیے گئے۔[1] لیکن اصلاحی تحریکوں کے ردعمل میں اٹھنے والی اس تحریک میں دوبارہ تشدد کے عناصر نظر آنے لگے۔ کیوں کہ اس تحریک کے تحت احتساب یا انکوائزیشن کے ادارے کی تشکیل دی گئی جس کے ذمے یہ کام تھا یہ کوئی شخص پروٹسٹنٹ مسلک کا اقرار کرتا تو اسے سخت سزائیں دی جاتیں۔ اسی انتہا پسندانہ رویے کے سبب رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کے درمیان مذہبی اختلاف کی بناء پر تیس سالہ جنگ ہوئی جو کہ 1618-1648 کے درمیان جاری رہی۔ اس میں زیادہ تر جنگیں جرمنی میں لڑی گئی جس میں لاکھوں لوگ مارے گئے۔ اس جنگ میں براعظم یورپ کے کئی اہم ممالک نے حصہ لیا۔ تیس سال گزرنے کے بعد یہ جنگ ویسٹ فالن معاہدہ کے ساتھ ختم ہوئی لیکن اس جنگ سے جو مسائل پیدا ہوئے ان پر جنگ ختم ہونے کے بعد بھی طویل عرصے تک قابو نہ پایا جا سکا۔[2]

عیسائیت دورِ جدید میں:

دورِ جدید میں عیسائیت آبادی کے اعتبار سے دنیا کا بڑا مذہب مانا جاتا ہے۔ ایشیاء، افریقہ اور امریکہ میں مذہب کی ترویج و اشاعت کی ایک اہم وجہ کالونیل ازم نوآبادیاتی نظام ہے۔ نوآبادیاتی نظام سے مراد کسی ایک علاقے کے لوگوں کا دوسرے علاقے میں جا کر اپنی نئی آبادیاں قائم کرنا اور وہاں قبضہ کرنا ہے۔ عام طور پر جہاں بھی نوآبادی قائم کی جاتی ہے۔ وہاں کے اصل باشندوں کو زیر نگیں لا کر ان پہ اپنے قوانین، معاشرت اور حکومت بھی مسلط کیے جاتے ہیں۔ تاریخ میں اس سے پہلے دوسرے علاقوں پر قبضہ کر کے انہیں غلام بنانے کا رواج رہا ہے۔ مگر جدید دور میں باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ ایک قوم کا دوسری قوموں پر مسلط ہونے کے اس عمل کا آغاز چودھویں صدی میں رومن ایمپائر نے کیا۔ یورپ میں مقیم عیسائیوں نے افریقہ، امریکہ اور ایشیاء میں اپنی نئی آبادیوں قائم کیں۔[3]

---

[1] محمد تقی عثمانی، مولانا، عیسائیت کیا ہے، ادارہ اشاعت، ص 74

[2] محمد مظہر الدین صدیقی، اسلام مذاسب عالم کا تقابلی ادارہ ثقافت، اسلامیہ لاہور سن اشاعت، 1982، ص 114-115

[3] دنیا کے قدیم و جدید مذاسب، ص 378

نوآبادیاتی کاکہ رجحان یورپ کے لیے نہ صرف معاشی اور سیاسی طور پر فائدہ مند رہا بلکہ اس سے ان کے مذہب کی بھی بہترین تبلیغ ہوئی۔ نئی آبادی قائم کرنے والے عیسائیوں میں کئی ایک مشتریز بھی ہوتی تھیں۔ ان مشتریز کے لوگ مقبوضہ علاقے میں اپنے مذہب کی بھرپور اشاعت کرتے تھے۔ ہندوستان میں عیسائیت کی باقاعدہ تبلیغ سولہویں صدی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے قیام سے ہوئی۔

پروٹسٹنٹ اصلاحی تحریک:

پاپائے روم کی حاکمیت کے دستور العمل کے بغیر چرچ اپنی فکر میں زیادہ عرصہ تک متحد نہ ہو سکا۔ بدعنوانی اور دنیاوی رجحانات پر عدم اطمینان روکنے اور پروٹسنٹوں سے اپنی "کھوئی ہوئی روحوں" کو واپس لینے کے لیے کیتھولک چرچ نے ایک جوابی اصلاح شروع کی۔ 1545ء میں کیتھولک قائدین اطالوی شہر ٹرینٹ میں اکٹھے ہوئے۔ ان کے پیشِ نظر ابھرتے ہوئے پروٹسٹنٹ ازم کے خلاف کیتھولک چرچ کی برتری کو پھر سے بحال کرنا تھا۔ کونسل آف ٹرینٹ کے اختتام (1563ء) پر جو اٹھارہ برس پر محیط تھی۔ روایتی کیتھولک عقائد کی پھر سے توثیق کی گئی، لیکن ایسی اصلاحات بھی متعارف کرائی گئیں جن کا مقصد پادریوں کے طبقہ میں پائی جانے والی بدعنوانیوں کا قلع قمع تھا جس کی وجہ سے پروٹسٹنٹ اصلاحی تحریک شروع ہوئی تھی۔[1]

ممنوعہ کتابوں کی ایک فہرست شائع کی گئی۔ 583 کتابیں ملحدانہ قرار دی گئیں۔ ان میں بائبل کے تراجم اور ایراسس، لوتھر اور کالوین کی تحریریں شامل تھیں۔ (یہ پابندی 1956ء تک برقرار رہی) ایک چرچ۔۔۔۔ بلڈنگ پروگرام شروع کیا گیا۔ مقصد ایسے بڑے بڑے گرجا گھر تعمیر کرنا تھا جن میں ہزار عس عبادت گزاروں کے لیے گنجائش ہو اور ڈیزائن صوتی یعنی سماعتی ہو۔ جہاں مقامی زبانوں میں وعظ ہو۔ اسے سوسائٹی آف جیسز تشکیل دینے کا فریضہ سونپا گیا۔ یہ مبلغین کی ایک جماعت تھی۔ جس کو یسوعی کہا گیا۔ یہ لوگ کیتھولک مسلک کی تبلیغ کے لئے اپنی جان کی پرواکئے بغیر کہیں بھی جانے پر تیار رہتے تھے۔ چرچ نے ایک اور طریقہ کار بھی اختیار کیا جس میں اپنی حاکمیت بحال کرنے کے لیے تفتیش کی جاتی۔ بدعت کے ملزمان کو مقدمات کا سامنا کرنا پڑتا۔ اور بعض اوقات ملزمان سے سچ اگلوانے کے لئے پر تشدد طریقے استعمال کئے جاتے۔

پروٹسنٹ تحریک کی پشت پناہی بہت سے جرمن شہزادے (مقامی ریاستوں کے حکمران) کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنی ریاستوں کی آزادی کو محفوظ بنانے کے لیے لوتھر کی مذہبی بغاوت فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے کیتھولک عقائد کو دبانے اور چرچ کا اثر و رسوخ اپنے اپنے علاقوں سے ختم کرنے کے اقدامات شروع کر دیئے۔ اب ان کا نعرہ تھا "ہر حکمران کا اپنا مذہب ہونا چاہیے" یہ الفاظ دیگر ان کا مطالبہ تھا کہ انہیں اپنے عوام کی پسند کا چرچ (مسلک) نافذ کرنے کا اختیار ہونا چاہیے۔ پروٹسٹ اصول اور عقائد مقبول ہوئے تو یورپ کا مذہبی اور سیاسی منظر ہمیشہ کے لیے بدل گیا۔ اس تحریک نے دوسرے حکمرانوں کو بھی موقعہ دیا کو اپنی بادشاہتوں کو پوپ ک کنٹرول سے آزاد کرانا چاہتے تھے۔ مثلاً انگلش اصلاحی تحریک اس وقت شروع ہوئی جب بادشاہ ہنری ہشتم نے اپنی ملکہ کیتھرائن آف ایریگان کو طلاق دینے اور این بولین سے شادی کرنے کے لیے پوپ کے فتویٰ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ہنری ہشتم ایک زمانے میں پروٹسٹنٹوں کے خلاف تھا۔ لیکن اب اس نے حمایت کا اعلان کر دیا۔ پروٹسٹنٹ ازم نے عیسائیت کی بہت سی شاخوں کو ابھرنے کا موقعہ دیا جن کو فرقے کہا جاتا ہے۔ صدیوں سے پورے یورپ میں صرف ایک ہی چرچ کیتھولک تھا۔ لیکن پروٹسٹنٹ اصلاح تحریک کے بعد ان گنت فرقے ابھر آئے۔ پروٹسٹنٹ اس

[1] دنیا کے قدیم وجدید مذاہب، ص 378

بات پر متفق تھے کہ رومن کیتھولک چرچ کی حاکمیت کو مسترد کیا جائے۔ لیکن وہ اس بات پر تیار نہیں تھے کہ ایک متحدہ متبادل نظام فکر مرتب کیا جائے۔ چنانچہ کچھ پروٹسٹنٹ تحریکوں کے درمیان جھگڑے شروع ہوگئے اور بعض اوقات اتنے ہی تند اور خون ریز تھے جتنے کتھولک اور پروٹسنٹوں کے درمیان شدت رکھنے والے رونما ہوئے تھے۔[1]

پروٹسٹنٹ فروغ:

ہنگامہ آرائی کے دنوں میں پروٹسنٹوں کے تین بڑے فرقے ابھرے۔ ایک لوتھرنز فرقہ تھا۔ جس کے پیروکار مارٹن لوتھر کی تعلیمات پر عمل پیرا تھے۔ دوسرا فرقہ پریسٹیبیریز کا تھا۔ یہ لوگ جان کیلوہن کے پیروکار تھے۔ تیسرا فرقہ اینگلی کن کا تھا۔ انگلستان سے تعلق رکھنے والے جدید پروٹسنٹوں کے اس گروہ نے کیتھولک مسلک کے بہت سے ایسے عقائد اور معمولات برقرار رکھے جن کو دوسری تحریکوں نے مسترد کر دیا تھا۔[2]

تاریک دور سے اخراج:

جوابی اصلاح جزوی طور پر اٹلی، سپین اور فرانس میں کامیاب رہی لیکن کیتھولک ڈھانچے میں ہونے والی تبدیلیاں بقیہ ممالک میں نہایت معولی تھیں اور یقیناً پروٹسنٹوں کو واپس کیتھولک دھارے میں لانے کے لئے کافی نہیں تھی۔ اس کے بعد یورپ مختلف عیسائی مسالک کی آماجگاہ تھا۔ جن میں سے ہر ایک عیسائیوں کے دل و ماغ جیتنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کیتھولک ازم دعویٰ کر سکتا تھا کہ وہ ایک طویل اور درخشاں ورثہ رکھتا ہے۔ جبکہ پروٹسٹنٹ ازم وقت کے تقاضوں کے مطابق تھا۔ اصلاح کاروں کا نعرہ تھا کہ تاریکی کے بعد روشنی تاریک دور کے بعد پروٹسٹنٹ مسلک کی خواہش تھی کہ کیتھولک ازم کے قرون وسطیٰ کا لبادہ اتار دے اور نظریات کی ایک نئی دنیا متعارف ہو۔ پروٹسٹنٹ پر اعتماد تھے کہ ایسی زبان میں بائبل کا بڑھنا اور سننا جس کو عام آدمی سمجھتا ہے خدا کے ساتھ ایک ایسے تعلق کی طرف لے جائے گا جو پادریوں، پوپ اور نجات کے پروانوں سے متزلزل نہیں ہوگا۔

تحریک صہیونیت:

صہیونیت کا مقصد بائبل کی سرزمین اسرائیل کے آس پاس ایک سیکولر ریاست قائم کرنا تھا۔ یہودیوں کی مشترکہ شناخت کا تصور، 19 ویں صدی کے وسط سے پہلے ہی شکل اختیار کرنا شروع کر چکا تھا، موسیٰ ہیس جیسے یہودی مفکرین کے ساتھ جن کے 1862 روم اور یروشلم میں کام کرتے ہیں۔ آخری قومی سوال نے یہودیوں کے فلسطین میں آباد ہونے کے لیے قومی سوال کے حل کے لیے دلیل دی۔ ہیس نے ایک سوشلسٹ ریاست کی تجویز پیش کی جس ہیں یہودی برادری کو ایک "حقیقی" قوم میں تبدیل کر دے گا،

جیسا کہ 19 ویں صدی کا آغاز ہوا، مشرقییورپ ہیں یہودیوں کے ظلم و ستم جہاں آزادی اس حد تک نہیں ہوئی تھی جتنی مغربییورپ میں (یا بالکل) بڑھ گئی تھی۔ زار الیگزینڈر دوم کے قتل کے بعد ریاست کے زیر اہتمام بڑے پیانے پر یہودیوں کے خلاف جنگ شروع کرتے ہوئے، 1903 سے 1906 کے خونی جھگڑوں کے ذریعے، جس نے ہزاروں یہودیوں کو ہلاک اور بہت سے زخمی کر دیا، 1894 میں فرانس میں ڈریفس افیئر جاری رکھتے ہوئے، یہودی تھے روس سے فرانس تک یہود دشمنی کی مسلسل حد دیکھ کر بہت صدمہ ہوا، ایک ایسا ملک جسے وہ روشن خیالی اور آزادی کا گھر سمجھتے تھے پہلے کے رد عمل

---

[1] مولانا پروفیسر محمد یوسف خان، تقابل ادیان، بیت العلوم، لاہور، ص: 31

[2] James Hasting "Encyclopedia of Religion and Ethics Volume VIII" (Edinburgh t&t George Street New York) pg. 438

میں، یہوداہ لیب پنسکر نے 1 جنوری 1882 کو پمفلٹ آٹو ایمنسیپیشن شائع کیا۔ یہ پرچہ سیاسی صہیونیت تحریک کے لیے باثر بن گیا۔ یہ تحریک آسٹریا کے ایکیہودی صحافی تھیوڈور ہرزل کی قیادت میں رفتار حاصل کرنے کے لیے تھی، جس نے 1896 میں اپنا پمفلٹ ("یہودی ریاست") شائع کیا تھا۔فرانس نے اپنے وفادار یہودی رعایا کے ساتھ کیسا سلوک کیا، اس نے ایک علیحدہ ہیودی ریاست بنانے کی تجویز پیش کی۔ 1897 میں ہرزل نے سوئٹزرلینڈ کے شہر باسل میں پہلی صہیونی کانگریس کا اہتمام کیا جس نے عالمی صہیونی تنظیم (ڈبلیو زیڈ او) کی بنیاد رکھی اور ہرزل کو اس کا پہلا صدر منتخب کیا۔ ریاست کے قیام کے بعد صیہونیت، اس کی مختلف شکلوں میں، یہودیوں کی سب سے بڑی سیاسی تحریک بن جائے گی، حالانکہ زیادہ یہودی ان ممالک کی قومی سیاست میں حصہ لیں گے جہاں وہ رہتے تھے۔[1]

نتیجہ:

قرآنِ کریم کی روشنی میں ہر انقلاب اور انقلابی تحریک کا اصلی و بنیادی ہدف و مقصد معاشرے کے اُمور کی اصلاح ہے اور اس ہدف کے حصول کے لیے کچھ عوامل درکار ہیں اور اس وجہ سے کہ ہر اجتماع اور معاشرہ اپنی دو قسم کی شناخت رکھتا ہے: شناختِ انفرادی اور شناختِ اجتماعی اس لیے یہ عوامل بھی انفرادی و اجتماعی دونوں حیثیتوں سے مربوط ہوتے ہیں۔

@ 2021 by the author، this article is an open access article distributed
Under the terms and conditions of the Creative Commons Attribution
(CC-BY) (http://creativecommons.org/licenses/by/4.0/)

[1] رضی الدین سید، یہودی مذہب مہد سے لحد تک، سن اشاعت جون 2016 مکتبہ قاسمیہ، علامہ نبوری ٹاؤں کراچی، ص 212